پر نہیں لاسکینگے۔ اسٹیٹ کا فرض ہے کہ جس طرح وہ اقتصادی مرفہ الحالی کے لیے ایک ایسا مکمل لائحۂ عمل بنارہا ہے۔ اُسے بچوں کی مذہبی تربیت دینے کا کام بھی اپنے ہی ذمہ لینا چاہیے۔ کسی اور سے کہنے کی بات نہیں۔ ہم ڈاکٹر ذاکر حسین ایسے روشن خیال اور باخبر بزرگ سے کہہ سکتے ہیں کہ آپ مثال کے طور پر علی گڈھ یونیورسٹی کو اپنے سامنے رکھیے۔ وہاں اسلامی دینیات کا مستقل شعبہ ہے۔ اور مشرقی زبانوں کے باقاعدہ محکمے قائم ہیں۔ لیکن پھر کیا وجہ ہے ؟ کہ ایک ایک ہزار روپیہ ماہوار تنخواہ پانے والے عربی زبان اور دینیات کے پروفیسروں سے تعلیم پانے والے طلبہ نہ صرف یہ کہ ان چیزوں سے ناآشنا رہتے ہیں بلکہ اپنی عملی زندگی میں وہ ان سے نفور بھی نظر آتے ہیں۔ اس کی وجہ اس کے سوا اور کیا ہے کہ علوم جدیدہ اور انگریزی زبان کی گرم بازاری سے وہاں ایک ایسا ماحول پیدا کر دیا گیا ہے کہ طلبہ کی ذہنیت سرتاسر "دفتری" ہو کر رہ گئی ہے۔ اور دوسری چیزیں اُن کی توجہات پر اس طرح چھاگئی ہیں کہ مذہب اور عربی زبان کی طرف یا تو انہیں متوجہ ہونے کی ضرورت ہی نہیں محسوس ہوتی اور اگر وہ متوجہ ہوتے بھی ہیں تو اس لیے کہ اُنہیں کسی کالج میں عربی کا پروفیسر بننا ہے یا آئی سی ایس کے امتحان میں انہیں عربی مضمون لینا ہے۔ پس اگر جبری تعلیم کی اس نئی اسکیم میں مذہب کے ساتھ بھی یہی "اچھوت پن" برتا گیا تو کون کہہ سکتا ہے کہ کل "اتحاد مذاہب" کا سبق لینے والے طلبہ مذہب کی ابجد سے ناواقفیت کے باعث اُس کے خلاف علم بغاوت بلند نہیں کرینگے یا کم از کم وہ اس حقیقت کو فراموش نہیں کرینگے کہ زندگی کی شاہراہیں مذہب کی مشعل سے ہی منور ہونی چاہئیں۔

بہرحال ہماری درخواست ہے کہ مذہبی تعلیم اوقاتِ مدرسہ میں ہی ہونی چاہیے۔ اور دوسرے مضامین کی طرح کافی نگرانی اور احساسِ اہمیت کے ساتھ۔ ورنہ یہ سب طفل تسلیاں بیکار ثابت ہونگی، اور اس تغافل و تساہل کا خمیازہ سب سے زیادہ مسلمانوں کو ہی بھگتنا پڑیگا۔